اسلام اور جدید مذاہبِ فکر

(۳)

جمہوریت اور اشتراکیت

——— پروفیسر محمد مبارک

اسلام کے مفہومات اور نظریات کو دوسرے مذاہب کے لوگوں تک ان کے اپنے نقطہ ہائے نظر کے مطابق منتقل کرنے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ اندیشہ تو اس میں ہے کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی اور مذہبِ فکر مثلاً اشتراکیت کی طرف چل پڑیں (خواہ وہ اشتراکیت بزعم پیروانِ مارکس سائنٹفک سوشلزم ہو خواہ اشتراکی کہلانے والے مذاہبِ فکر میں کا کوئی اور مسلک)، یا جمہوریت کی طرف رُخ کریں یعنی انھیں ایک مذہب سمجھ لیں اور ان کا فلسفہ اپنا لیں اور کہنے لگیں کہ یہ اشتراکیت یا یہ جمہوریت خود اسلام کا ہی ایک حصّہ ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ طرزِ فکر یقیناً ایک فریب اور ملمع کاری ہے، جس سے اسلام کے اپنے مفاہیم مجروح ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اشتراکیت اور جمہوریت کے ساتھ اسلام کا کوئی نقطۂ اتصال اور کوئی وجہ اشتراک نہیں۔

جمہوریت

جمہوریت پسندوں کا خاص رجحان دراصل انفرادی استبداد اور کسی مخصوص طبقہ یا خاندان کی حکومت و سیادت کا مقابلہ ہے۔ یورپ کی تاریخ میں یہ رجحان مطلق العنان بادشاہوں

بالادست یا اختیار طبقوں اور با اقتدار علمائے دین کے استبداد کے خلاف ردعمل کی شکل میں نمودار ہوا۔ لہٰذا جمہوریت پوری قوم یا قوم کی اکثریت کو حکومت میں شریک کرنے کی جدوجہد کرتی رہی اور جمہوریت کو عملاً نافذ کرنے کے لئے مختلف قوموں نے مختلف طریقے اختیار کئے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کیا ہمارے لئے یہ کہنا جائز ہوگا کہ اسلام جمہوریت کے منافی ہے؟ کیا ایسا کہنا اسلام کی صورت کو مسخ کر دینا نہیں ہے؟ جن لوگوں کے پیش نظر حکومت کے صرف دو نظام ہیں یعنی استبدادیت یا جمہوریت، کیا ان سے یہ کہنا کہ "اسلام جمہوریت کے مخالف ہے" اسلام کو بدترین صورت میں پیش کرنا نہیں ہوگا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ استبداد کے مقابلے میں اسلام جمہور کا ساتھ نہیں دے گا؟ کیا اسلام کا موقف قطعاً یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس محاذ میں شامل ہو جائے جو انفرادی استبداد اور ترجیحی سلوک کا مقابلہ کر رہا ہو؟

لیکن ہمیں یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ اسلام بغیر کسی شرط کے مطلقاً جمہوری ہے کیونکہ ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے جمہوریت افراد اور جماعتوں سے متعلق کچھ ایسے افکار و مفاہیم سے نسبت حاصل کر چکی ہے جنھیں اسلام تمام تر قبول نہیں کرتا بلکہ ان سے اکثر مقامات پر متعارض ہوتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت کا ایک بنیادی نظریہ ہے کہ ریاست میں اصل اہمیت فرد کی ہے اور دراصل فرد ہی کی مصلحت کے لئے ریاست وجود میں آتی ہے۔ فرد اپنے اعمال میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق اقتصادی یا نظریاتی امور سے ہو۔ حکومت کا سب سے اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد کی آزادی میں توازن برقرار رکھے۔ جمہوریت کا یہ فلسفہ اسلام کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ عقائد میں الحاد اور ایمان کے درمیان تفریق کو قائم نہیں رکھتا اور اجتماعی مصلحت کے لئے ایک طرف بے قید سرمایہ داری کو تسلیم کرتا ہے دوسری طرف سرمایہ داری پر پابندی عائد کرنے کا بھی قائل ہے۔ اسلام ان تمام رجحانات میں مساوات کا قائل نہیں۔ وہ فرد کو ایسی مطلق آزادی نہیں دیتا جس سے الحاد، بداخلاقی اور سماجی ظلم و ستم کو تقویت ملے۔ اس کے علاوہ اسلام کا جمہوریت سے ایک اور بنیادی اختلاف بھی ہے۔ اگرچہ اسلام میں قوم کی مصلحت قانون سازی کا مرکزی نقطہ ہے۔ اور حکومت کی بنیاد باہمی مشورے اور حاکم کے جواب دہ ہونے کے اصولوں پر ہے۔ لیکن حاکمیت کا آخری مرجع

ذات الٰہی ہے۔ وہی درحقیقت ریاست کا سرچشمہ ہے۔ اسی کا ارادہ (جس کا مظہر قرآن کریم ہے)
حقیقی قوت حاکمہ ہے۔ اس کے برخلاف جمہوریت میں قوم حکومت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ قوم کا
ارادہ اور منشا قطعاً آزادانہ ہوتا ہے، اور اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

اگر قوم کو حکومت کا سرچشمہ قرار دینے سے یہ مراد لی جاتی کہ حکومت قوم کی تفویض کردہ ہے۔ اور حاکم قوم کا نمائندہ ہو کر حکومت حاصل کرتا ہے، وہ خود اپنی ذات سے، یا وراثۃً یا براہ راست خدا کی طرف سے اقتدار حاصل نہیں کرتا تو اس میں کوئی شبہ نہیں اسلام اس سے اتفاق کرے گا (۱)۔ لیکن قوم کے افراد میں (خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم) جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو آخری فیصلہ صرف کتاب اللہ کا ہوگا، جس نے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے اور نشانات سے اس کی حد بندی فرما دی ہے۔ قوم غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ افراد قوم، حاکم پر نگران ہوتے ہیں۔ وہ حق کا مطالبہ اور زیادتی کے خلاف احتجاج کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی نصوص کی تعبیر اور اس کے مفہومات کے تعین میں حاکم کی بجائے علمائے کرام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اس کی کوئی قید نہیں کہ وہ علما حکومت کے محکموں میں تعینات ہوں یا محض رسمی علماء ہوں۔ جب خوارج نے لاحکم الا للہ اور لاحکم الا للقرآن کا نعرہ لگایا تھا تو حضرت علیؓ نے ان کی تردید میں یہی فرمایا تھا کہ قرآن کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے۔ قرآن کا فیصلہ بہرحال کچھ لوگ بتائیں گے، خود قرآن بتانے کے لئے نہیں آئے گا (۲)۔ یعنی کوئی ایسا آدمی ضروری ہے جو فیصلہ کرنے کا اہل ہو۔ لہٰذا انسان کا فیصلہ ناگزیر ہے لیکن اس فیصلہ کرنے والے پر لوگوں کی نگرانی ضروری ہے۔ اور ایسے لوگوں کا وجود لابدی ہے جو قرآن کریم اور اس کے مقاصد کی سمجھ رکھتے ہوں اور اس کے احکام کی تطبیق کی اہلیت رکھتے ہوں۔

خلاصہ مبحث یہ ہے کہ اگر ہم جمہوریت کو ایک اجتماعی مذہب کی حیثیت سے لیں اور

۱- یہ اہل سنت کی رائے ہے ہم نے اپنی کتاب الدولۃ عند ابن تیمیہ ("ابن تیمیہ کے سیاسی نظریات")، ص ۱۸۰ میں اس موضوع پر بحث کی ہے۔

۲- نہج البلاغۃ، تحکیم کے سلسلے میں حضرت علیؓ کا ارشاد

اس کے جداگانہ وجود کو تسلیم کریں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عین اسلام ہے یا اسلام اس سے کوئی مماثلت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مذاہب اپنی اساسیات، اپنے فلسفہ اور نتائج تطبیق کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ جب ہم جمہوریت کا ایک ایسے رجحان کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں جو انفرادیت، استبداد اور تفریق وامتیاز کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ اور جمہور کی بہبودی کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ انھیں حکومت میں شریک کرتا اور محاسبہ کا حق دیتا ہے تو بلاشبہ ان معنوں میں اسلام بھی جمہوری اندازِ نظر رکھتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اسلام کی اپنی ایک جمہوریت ہے جو اسی کے نظام کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جمہوریت حکام کے استبداد کی روک تھام کرتی اور قوم کو ان کی نگرانی اور محاسبہ کا حق دیتی ہے۔

اشتراکیت

دوسری مثال اشتراکیت کی ہے۔ بے شمار محققین نے اس لفظ کو اسلام کے اس تصورِ عدل کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے جو معاشرہ کے تمام افراد کو مساوی حیثیت دیتا ہے۔ اشتراکیت کے ضمن میں ہمارے موقف کی وضاحت جمہوریت کے ذیل میں تفصیلی بحث سے ہو چکی ہے۔ اشتراکیت کو جب ایک ایسے مذہبِ فکر کی حیثیت سے لیا جائے کہ اس کا فلسفہ، اس کے مفہومات اس کا اقتصادی نظام (جس کی ایک واضح شکل قومی ملکیت ہے)، سب ہی کچھ شامل کیا جائے تو اسلام اس سے قطعی جداگانہ چیز ہے۔ دونوں مذاہب کی مبادیات اور اساسیات مختلف ہیں۔

اشتراکیت ہمارے ہاں ایک اور مفہوم میں بھی رائج ہے کہ قوم کے تمام افراد کو منافع اور مصالح میں یکساں شریک کیا جائے۔ منافع کی تقسیم اور منفعت کے امکانات میں مساوات پیدا کی جائے۔ اور اس مقصد کے لئے حکومت کو اقتصادی کارگزاریوں میں مداخلت کا حق دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ مفہوم ہر قسم کی اشتراکیت پر منطبق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف ملکوں میں طریق کار مختلف ہیں ـــ اس مفہوم کے اعتبار سے اشتراکیت کوئی مذہب نہیں بلکہ محض ایک رجحان کا نام ہے جو یورپ میں سرمایہ داروں کے استبداد کے ردعمل میں پیدا ہوا۔ کیونکہ وہاں سرمایہ دار طبقہ ترجیحی حقوق کا مالک بن بیٹھا تھا۔ یہ دراصل اس آزاد روی کا

نتیجہ تھا جو بے قید معیشت کی قائل تھی اور حکومت کی مداخلت کے سراسر خلاف تھی ظاہر ہے اسلام اشتراکیت کے اس رجحان کا مخالف نہیں ہے۔ اسلام کا مقتضا بھی پایانِ کار منافع کی عام تقسیم اور معاشرتی عدل و انصاف کا قیام ہے بلکہ جب مصلحت کا تقاضا ہو تو اسلام حکومت کو اقتصادی بلکہ غیر اقتصادی امور میں بھی مداخلت کا حق دیتا ہے[۳]۔ یہ کہنا کہ اسلام اشتراکیت کے اس مفہوم کا سرے سے مخالف ہے، سادہ الفاظ میں یوں کہنا ہوگا کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم، سرمایہ داروں کے ترجیحی حقوق اور تجاوز کی تائید کرتا ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد افراد کی اقتصادی کارگذاریوں کی تحدید، حکومت کی مداخلت اور معاشرہ کی مصلحت کے تحفظ پر ہے۔ اسلام بھی حکومت کی مداخلت کا قائل ہے۔ چنانچہ ذخیرہ اندوزی کا انسداد، قحط کے زمانے میں غذائی سامان کے تاجروں کو عادلانہ نرخ پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا اور زمانۂ جنگ میں مالداروں پر زکواۃ کے علاوہ بار ڈالنا اور اگر معاشرہ میں ایسے نادار موجود ہوں کہ زکوٰۃ سے ان کی کفالت نہ ہوسکے تو مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال لینا، ایسی مشہور مثالیں ہیں جن کا تذکرہ فقہا کی کتابوں میں بالصراحت موجود ہے۔ یہ مثالیں اسی رجحان کی ترجمان ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام حکومت کی مداخلت کا قائل ہے تاکہ معاشرتی عدل قائم ہوسکے۔ لہٰذا یہ بات کہنا کہ اسلام اشتراکیت سے مماثلت نہیں رکھتا، نہ صرف اشتراکیت کی حقیقت سے ناآشنائی ہوگی بلکہ اسلامی تعلیمات و احکام سے بھی جہالت ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

" مثل المؤمنین ... مثل الجسد اذا اشتکی منہ عضوٌ تداعی لہ سائر الجسد بالسّھر والحمّی "	تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب ان میں سے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے۔ تو رات کو جاگنے اور حرارت کی وجہ سے سارا بدن اسکی اذیت محسوس کرتا ہے[۴]۔

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے۔

قوم استھموا علیٰ سفینۃ فی البحر فاصاب بعضھم اعلاھا واصاب بعضھم اسفلھا فکان الذین فی اسفلھا یصعدون	کچھ لوگ سمندر میں ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے کچھ نیچے کے حصّے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے

فیستقون الماء فیصبون علی الذین فی اعلاھا فقال الذین فی اعلاھا لا ندعکم تصعدون فتؤذوننا فقال الذین فی اسفلھا فانا ننقبھا فی اسفلھا فنستقی فان اخذوا علی ایدیھم فمنعوھم نجوا جمیعا وان ترکوھم غرقوا جمیعا"	کے لئے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے روکا کہ اس سے ہمیں دقّت ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں اور پانی حاصل کرلیں گے۔ اب اگر انھیں روکا نہ جائے تو سب غرق ہوں گے۔ اگر روک دیا تو سب بچ جائیں گے (۵)

یہ مسلمہ امر ہے کہ اسلام اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا کہ رعایا کا کوئی فرد بھوکوں مرے، خواہ اس کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایک آدمی اسلامی حکومت کا وفادار شہری ہے تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات کی کفالت بھی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں غیر مسلم اور اہل کتاب نادار لوگوں کے لئے ایک مخصوص شعبہ قائم تھا۔

یہ رجحان کوئی سرسری بات نہیں تھی نہ اخلاقی مواعظ و نصائح تک محدود تھی۔ بلکہ فقہا نے تفصیل کے ساتھ اس کے احکام مرتب کر دئیے تھے جو عملاً نافذ ہوئے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ قواعد عامہ میں بھی ان کی بنیادیں ملتی ہیں۔ ہمارے اس موضوع سے متعلق اس قسم کے قواعد عامہ تقریباً ہر جگہ مل سکتے ہیں۔ مثلاً

الضرر یزال	ضرر کو بہر حال دور کیا جائے گا
لا ضرر ولا ضرار	نہ ضرر برداشت کیا جا سکتا ہے نہ پہنچایا جا سکتا ہے
یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام	ضرر عامہ کو دور کرنے کے لئے خاص ضرر کو برداشت کیا جائے گا۔

۳۔ الدولۃ عند ابن تیمیہ (ابن تیمیہ کے سیاسی نظریات، محولہ بالا ص ۳۸
۴۔ صحیح مسلم، جلد چہارم ص ۲۰۰۰، باب ۴۵۔ قاہرہ، ۱۹۵۵ء
۵۔ ترمذی، جلد دوم، ابواب فتن ص ۴۳، کانپور ۱۳۰۴ھ

ان قواعد کی تشریح میں فقہا نے مختلف مثالیں دی ہیں مثلاً ایسی مملوکہ دیوار جو عام راستے کی طرف جھک رہی ہو۔ گرا دینا واجب ہو گا۔ صاحبین کے نزدیک ایک بیوقوف (سفیہ) آدمی کے تصرفات پر مطلقاً پابندی لگائی جا سکتی ہے تاکہ ضرر عام کی روک تھام ہو سکے[۲]۔ امام ابن تیمیہ تو اس سلسلے میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے نزدیک ماہر فن اشخاص کو مفاد عامہ کے پیش نظر کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ ہم نے اب تک کہا ہے اس پر اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت سے ہمیشہ روس ہی کا منافیٔ اسلام مذہب مراد نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ ایک عام رجحان کے طور پر بھی مستعمل ہے جس میں مختلف مذاہب فکر شریک ہیں۔ چنانچہ خود یورپ میں مسیحی اشتراکی (CHRISTIAN) (SOCIALISTS) کے نام سے کچھ جماعتیں ابھر رہی ہیں۔ حالانکہ اگر اشتراکیت کو محض قائم بالذات مذہب تسلیم کیا جائے تو مسیحیت کا اشتراکیت کے ساتھ صفت کے طور پر استعمال ناممکن ہو گا۔

اسلام میں ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں جو جمہوریت اور اشتراکیت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تاہم ان رجحانات کو مسلمانوں کی زندگی میں شعار عام کا درجہ حاصل نہیں، نہ یہ ہماری ہیئت اجتماعیہ کا عنوان بن سکتے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب کی بعض صفات کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں لیکن دوسری بہت سی صفات اور بنیادی تصورات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جو ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں

تمام سیاسی اور اقتصادی نظامات کی کچھ نہ کچھ اعتقادی بنیادیں ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ نظامات دراصل اسی عقیدہ یا فلسفہ کے خارجی مظاہر ہوتے ہیں لہٰذا اشتراکیت سے وابستگی دراصل اس عقیدہ سے وابستگی ہوگی کہ پیداوار زندگی کا محور ہے اور وجود کی اصل مادہ (MATTER) ہے اس تصور میں علم اور عقل دونوں محض پیداوار (Production) اور مادی زندگی کے خدمت گزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں فرد انسانی اس بڑی مشین کا ایک حصہ ہوتا ہے جسے ہیئت اجتماعی کہتے ہیں اور جو حکومت کی صورت میں متشکل ہے۔ اگر ہم ان شعاروں کو اپنی نشأۃ ثانیہ کا واحد عنوان

---

(۲) ابن نجیم کی کتاب "الاشباہ والنظائر" میں ان قواعد عامہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

قرار دیں تو ضمناً ہم اس بات کو تسلیم کرلیں گے کہ ہم ان اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ہمارے نزدیک اپنے افکار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

اسلام کی اشتراکیت

معاشرتی عدل اور تقسیم دولت کے لئے قانون بنانے اور اپنی نشأۃ ثانیہ کے لئے اشتراکیت کو عنوانِ اولین قرار دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے اسلام کی اجتماعی تحریک ایمان باللہ کے عقیدے اور افراد کی مساوات سے شروع ہوتی ہے جس کی غایت معاشرتی عدل کا قیام ہے یہ ہے اسلام کی اپنی اشتراکیت، جس کی غایت محض مال اور اس کی تقسیم نہیں، بلکہ یہ دراصل اس روحانی تحریک کی ایک شاخ ہے جس کا مقصد ایک خاص نظام کے اندر خدا کے بندوں کے مابین عدل و انصاف کا قیام اور حسن سلوک کے ذریعہ رضائے الٰہی کی تحصیل ہے بغور فرمائیے اسلامی نظام کی تعبیر کے لئے اشتراکیت کے لفظ میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ وہ اس نظام کا صحیح عنوان بن سکے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اسلام کے امتیازات کی اس طرح حفاظت کرنا چاہیئے کہ یہ دوسرے مذاہبِ فکر کے مفہومات سے مشتبہ نہ ہونے پائیں

مفہومات کی تصحیح

مشتبہ مفہومات کی تصحیح کا کام اسلام کے ہر دور میں برابر ہوتا رہا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے محافظ علما ہر دور میں محدثاتِ امور، عقائد میں درپردہ اضافوں اور جدید الخرافات کی تردید کرتے رہے ہیں۔ بدعات کو علما نے مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ جو بدعات عادات سے متعلق ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس وغیرہ کے اسلوب تو یہ چیزیں ناپسندیدہ بدعات میں شمار نہیں ہوتیں بشرطیکہ کوئی چیز براہ راست نصوص سے متصادم نہ ہو۔ نو ایجاد آلات وسائل نقل وحمل وغیرہ کے بارے میں بدعت کا لفظ مذموم معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس اسے خدا کی نعمت شمار کیا گیا ہے کیونکہ ان میں بنی نوعِ انسان کی بہبود مضمر ہے سب سے زیادہ

خطرناک بدعات عقائد سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ بدعات عقیدہ کے محدود مفہوم تک ہی منحصر نہیں بلکہ یہ تمام بنیادی افکار و رجحانات کو شامل ہیں۔ تیسری قسم کی بدعات وہ ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں۔ ان کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ عبادات سب توقیفی ہیں ان میں کمی یا بیشی نہیں کیجا سکتی۔

یہ تصحیح ہر زمانے میں علما اور ائمہ اسلام کے ہاتھوں ہوتی رہی ہے۔ وہ اس قسم کے انحرافات سے باخبر رہتے تھے اور نئی داخل شدہ بدعات کی تردید کر کے افکار کی تصحیح کرتے رہتے تھے ان کی ایک واضح مثال دمشق کے فرزند جلیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ تھے۔ ان کا بہترین کارنامہ اس رجحان کی تخلیق ہے کہ یونانی عقلیت اور باطنی رجحانات کے مقابلے میں اسلامی افکار کو رواج دیا جائے۔

آج ہمیں اس تصحیح کی زیادہ ضرورت ہے۔ خواہ یہ مفہومات مغربی افکار کے زیر اثر رواج پائے ہوں یا مشرقی عقلیت سے اثر پذیر ہوئے ہوں۔ خصوصاً ان افکار کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔ جو اسلامی عقلیت، یونانی عقلیت اور ایرانی اور ہندی عقلیت کا معجون مرکب ہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی فکر کی از سر نو تعمیر کریں اور اپنے ذہنوں کو ان افکار سے صاف کر دیں جنھیں ہم آج تک بدیہیات سمجھتے آئے ہیں۔ یہ افکار ہمارے فکری، سیاسی اور اقتصادی ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ہماری ترقی اسی پر موقوف ہے۔

آج کل انسانیت کا سامنا متعدد مذاہب سے ہے۔ ہر مذہب میں اگر ایک پہلو حق کا ہے تو دوسرا پہلو باطل کا بھی موجود ہے۔ ان میں سے کوئی مذہب بھی انسانی مشکلات کو بنیادی طور پر توازن کے ساتھ حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو بیک وقت مادی ترقی اور اخلاقی و روحانی ارتقار کا ایک توازن کے ساتھ ضامن ہو سکتا ہے۔ نظاماتِ اجتماعی کے لئے اسلام خود انسان کے ضمیر میں اپنی بنیادیں تعمیر کرتا ہے۔ وہ فرد کے لئے ایسا وسیع میدان مہیا کرتا ہے جس میں وہ استبدادی انداز سے محفوظ ہو کر مادی اور روحانی ترقی کر سکے۔ اسلام زندگی کو ایک وحدت کے اعتبار سے لیتا ہے

اس کے تمام پہلو۔ سیاست، معیشت، اخلاق، عبادت، عقیدہ اور قانون سازی، حیاتی وحدت کے ساتھ ایک نظم میں پیوستہ ہیں۔

مختلف مذاہب کا مطمحِ نظر، خواہ وہ دینی ہوں یا اجتماعی، زندگی کا کوئی ایک اہم مقصد ہوا کرتا ہے۔ مثلاً عدالتِ اجتماعی، حیات روحانی۔ یا فردِ انسانی کی حریت۔ لیکن اسلام نے ان تمام مقاصد میں ترتیب قائم کر کے ان کو اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ یہ تمام مقاصد ایک قوت سے وابستہ ہیں جو خدائے برتر کی ذات ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ آیت ۲۶۸)

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

(ارمغانِ حجاز۔ ابلیس کا مجلس شوریٰ سے خطاب)